# نظریاتی بحران اور اس کا حل

ڈاکٹر برہان احمد فاروقی

صرف عالمِ اسلام ہی نہیں بلکہ پوری نوعِ انسانی آج نظریاتی بحران سے دوچار ہے اس نے مسلمانوں کے لیے جو مسئلہ پیدا کیا ہے وہ یہ ہے کہ اس بحران کا مداوا کیا ہے۔

یہ مسئلہ صرف اسی صورت میں حل ہو سکتا ہے جب ہم یہ جانیں کہ:

- ــــ نظریہ (آئیڈیالوجی) کیا ہے؟
- ــــ بحران کیا ہے؟
- ــــ یہ کیسے پیدا ہوتا ہے؟
- ــــ اس سے کیا مسائل پیدا ہوتے ہیں؟
- ــــ ان کے حل ہونے میں موانع کیا ہیں؟
- ــــ وہ کیسے حل کئے جا سکتے ہیں؟

## آئیڈیالوجی (نظریہ) کیا ہے؟

عملی زندگی میں نظریہ عمل سے پہلے درکار ہوتا ہے جسے عام گفتگو میں ہم اصول اور ارکان کہتے ہیں۔ وہی عمرانیات کی زبان میں نظریہ (آئیڈیالوجی) اور نظام (آرڈر) کہلاتا ہے لہٰذا آئیڈیالوجی عبارت ہے۔ تصورات، معتقدات اور افکار کے مجموعہ سے جو کسی گروہ جیسے قوم، طبقہ، ذات پات، پیشے، مذہبی فرقے سیاسی جماعت وغیرہ کے ساتھ مختص ہو۔ نظریات جغرافیائی حالات، آب و ہوا کے مواقع، مادی افعال، مختلف گروہوں کے ثقافتی ماحول کے ساتھ مشروط اور ان کے تحت متعین ہوتے ہیں ضروری نہیں کہ وہ باہم دگر متباین ہوں بلکہ ان میں توارد بھی ہو سکتا ہے دو افراد ایک ہی قوم کے فرد ہوتے ہوئے اپنے قومی نظریے میں شریک ہو سکتے ہیں اور اپنے اپنے پیشوں

کے نظریات میں ایک دوسرے سے مختلف ہو سکتے ہیں۔ نظریہ آئیڈیالوجی کی اصطلاح اپنے ماخذ کے اعتبار سے لادینی (سیکولر) ہے۔

## قرآن کی اصطلاح میں نظریہ اور نظام

قرآنی اصطلاح میں "کتاب" اور سنت آئیڈیالوجی اور آرڈر کی حیثیت رکھتے ہیں جن کا قرآنی مفہوم قرآن مجید کی ان دو آیات کے حوالے سے سمجھا جا سکتا ہے۔

i۔ " لِکل امۃ اجل " (ہر امت کے لیے فیصلہ کن ساعت ضروری ہے۔

ii۔ " لِکل اجل کتاب " (ہر فیصلہ کن ساعت کے لیے کتاب ضروری ہے۔

کتاب کی اہمیت تب ہی واضح ہو سکتی ہے جب ہم یہ سمجھ لیں کہ فیصلہ کن ساعت میں فیصلہ کس بات کا ہونا ہے تو جو فیصلہ ہونا ہے وہ یہ ہے کہ کونسی امت کتاب کے اتباع کی بنا پر اس کی حقدار ہے کہ وہ باقی رہے اور ترقی کرے اور کونسی امت اس کی سزاوار ہے کہ اسے کتاب سے انحراف کرنے کی بنا پر مٹا دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید لا ھدی ولا کتاب کہہ کر کافروں پر طنز کرتا ہے کہ ان کے پاس نہ واضح نصب العین ہے اور نہ حتمًا نتیجہ خیز ہدایت (لائحۂ عمل) ہے۔

(نظریہ قرآنی مفہوم کے مطابق) ان عناصر پر مشتمل ہے۔

- **نصب العین** وہ غایت قصویٰ یا منتہائے مقصود ہے جس کے حصول سے ہر کمال وابستہ ہے۔
- **تصور کائنات** موجودہ واقعات اور مستقبل کے امکانات کا وہ جائزہ جس کی بنیاد پر نصب العین کا حصول اور معیار کا واقعہ بن جانا متصور ہو۔
- **مؤقف یا زاویہ نگاہ** وہ موقعہ اور محل جہاں سے تمام اسباب اور واقعات اور اعمال اور افراد کا موازنہ کر کے حکم لگایا جا سکے۔
- **معیار** وہ اصول جس کے حوالے سے تمام اشیاء، تمام مساعی کا جائزہ لے کر انہیں پرکھا جا سکے۔
- **لائحۂ عمل** پہلے سے ترتیب دیا ہوا فرائض و اعمال کا وہ گوشوارہ جو مطلوبہ نتائج

تک پہنچانے کی ضمانت رکھتا ہو۔

• — **دعوت** وہ عمل جسے اتمام کو پہنچانے پر کوئی گروہ مامور ہو جس کے نتیجے میں اس گ وہ کو دوام و استمرار میسر آئے۔

**بحران کیا ہے؟** وہ نظریاتی بحران جس سے آج اسلام دوچار ہے زندگی کے اخلاقی، عمرانی، معاشی، سیاسی، اور بین الاقوامی پہلوؤں میں نمایاں ہے کیونکہ واقعات اور حالات ایسے نقطے پر پہنچ گئے ہیں جہاں معاشرے کے لیے بہتری یا خرابی کے انداز میں فوری تبدیلی ضروری ہو گئی ہے اور عمرانی ضبط کا اثر رُخ اور سمت متعین کرنے کے اعتبار سے غیر یقینی ہو گیا ہے اور آخری معیار پیدا ہو گیا ہے کہ اتحاد کو ترقی دینا ضروری ہے یا اختلاف کو بڑھانا۔

یہ بحران کیسے پیدا ہوتا ہے؟ اور امت مسلمہ میں اس بحران نے کیا شکل اختیار کی ہے؟ اس سوال کو حل کرنا ضروری ہے۔

انسانیت یا تو پیغمبرانہ تعلیمات کی پیروی کا راستہ اختیار کر سکتی ہے یا انحراف کا کیونکہ اللہ پاک فرماتا ہے۔

عَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَمِنْهَا جَائِرٌ۔

"اللہ کی طرف ایک سیدھا راستہ ہے اور ایک ٹیڑھا"

ہم مسلمان اس بات کا دعوے کرتے ہیں کہ اصولاً ہم ایک عالمی قوم ہیں ایک نظریاتی گروہ ہیں اور ایک جماعت ہیں بحیثیت قوم کے ہماری عمرانی وحدت کی بنیاد اسلام ہے۔ بحیثیت ایک نظریاتی گروہ کے ہماری دعوت غلبہ اسلام ہے یعنی منزل من اللہ قانون کا روئے زمین پر غلبہ اور بحیثیت ایک جماعت کے ہماری وفاداری اپنے ہادی اعظم اور اللہ کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر مرکوز ہے۔

عمرانی وحدت کی یہ بنیاد، یہ دعوت اور یہ وفاداری محض معتقدات کلامیہ نہیں ہیں بلکہ تاریخی حقائق ہیں انہوں نے ابتداء ہی سے اسلام کو سرسبز و شاداب رکھا ہے۔ لیکن

ایک فرد کی طرح ہر عمرانی وجود بھی زوال و انحطاط اور بیماری اور موت سے ہمکنار ہوتا ہے۔ اجتماعی موت عبارت ہے غایت کے تصور کے خیرہ ہو جانے، تصور کائنات کی روح کے فنا ہو جانے اور اخلاقی سیرت کے مسخ ہو جانے سے۔

اگرچہ ہم کرہ ارض پر ۴۹ مسلم ریاستوں کی حیثیت سے موجود ہیں مگر فکری اور معاشی سطح پر ہم پٹ کر رہ گئے ہیں اور حیرت زدہ اور مبہوت ہو کر اپنی راہ التباس کے اندھیرے میں ٹٹول رہے ہیں اور پوری بصیرت نہ ہونے کے باعث ناگزیر انداز سے غیر اسلامی بلکہ مخالف اسلام اقدار کو (اگر انہیں اقدار کہا جا سکتا ہے) اپنے اندر جذب کرتے چلے جا رہے ہیں۔

ہم اپنی دعوت کے شعور سے تقریباً محروم ہو چکے ہیں کیونکہ ہمارے حیات اجتماعی کے سرچشموں یعنی کتاب وسنت اور تاریخ اسلام کے تصورات مسخ ہو چکے ہیں اور اب ان سے ہمارے اندر ایسا ولولہ پیدا نہیں ہوتا ہے جو روحانی جوش، ایمانی حرارت عطا کر کے قومی کردار کی تخلیق میں مؤثر ہو اور اختلال انگیز مؤثرات کے جواب میں قومی کردار کی حفاظت کر سکے کیونکہ ہم قرآن کو صحف ماسبق کی تمثیل پر قیاس کر کے اسے اوامر و نواہی کا ماخذ سمجھنے کے علاوہ اس کے بارے میں کوئی تصور نہیں رکھتے اس لیے ہم نے قرآن کو صرف قرآن کا ماخذ سمجھا ہے امم سابقہ میں کوئی امت زوال پذیر ہو جانے کے بعد بغیر نئی بعثت کے نہیں اٹھائی جا سکی اور زوال سیرت کا مطلب یہ تھا کہ قانونی ضابطے کی خلاف ورزی کا طرز عمل اختیار کیا جاتا جس کے معنی یہ ہیں کہ اقدار حیات مٹ گئیں اور زوال کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ معاشرہ قوت نافذہ سے محروم ہو جائے لہٰذا کوئی امت زوال پذیر ہو جانے کے بعد قانونی ضابطے کے حوالے سے اقدار حیات پیدا نہیں کر سکی کیونکہ قانون کا وظیفہ اقدارِ حیات کو پیدا کرنا نہیں بلکہ صرف ان کی حفاظت کرنا ہے بشرطیکہ وہ موجود ہوں اور قانون کو قوت نافذہ میسر ہو۔ تکمیل فقہ کے باوجود قانون اقدار حیات کی حفاظت تو اس لیے نہ کر سکے کہ وہ مٹ گئی ہیں اور انہیں پیدا اس لئے نہ کر سکے کہ یہ قانون کا وظیفہ نہیں اور اقدار حیات کے پیدا کرنے کی تدبیر کی طرف ہم متوجہ نہ ہوں اور یہ غور کرنا نہ چاہیں کہ مؤثرات زندگی کے بدل جانے سے پہلے جو ضابطہ مدون کیا گیا تھا اس کے ذریعہ ان اقدار کو پیدا نہیں کیا جا سکتا جو غلبہ اسلام سے مسلّم ہو گئی تھیں۔

ہم اپنے عظیم الشان ثقافتی ورثے کی نسبت اپنے اندر ایک شرمساری اس لیے محسوس کرتے ہیں کہ ہم دوبارہ اپنی زندگی میں اسے پیدا نہیں کر سکتے۔ ہم نے علم بالوحی کو انسانی علم کے نمونے پر ڈھال کر یہ تو محفوظ رکھا کہ وہ نظام اخلاق و معاشرت اور وہ قانون وہ نظام عدل کیا تھا لیکن علم بالوحی کے اس مسئلے سے غافل ہو گئے کہ زندگی اخلاقی نظام پر ڈھلے گی کیسے مثالی معاشرہ پیدا کیسے کیا جائے گا اور عادلانہ معاشی نظام پیدا کیونکر ہو گا اور سیاسی تناقض سے پاک نظام سیاست کیسے عمل میں آئے گا ہم اپنے زوال پذیر معاشرے کی اصلاح کے لیے مغرب کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ اور ہم میں سے بعض لوگ بے حیائی کے اس درجے کو پہنچ گئے ہیں کہ یہ کہنے میں بھی کوئی شرم محسوس نہیں کرتے کہ اسلامی قانون فرسودہ ہو گیا ہے اور دور جدید کے تقاضوں سے مطابقت نہیں رکھتا وہ بالواسطہ ہمارے دشمنوں کو تقویت پہنچا رہے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ اسلام ایک ختم شدہ قوت ہے۔

وہ معصومانہ انداز میں اسلام کے اس کردار کو فراموش کیے دے رہے ہیں کہ اسلام نے دنیا کو ایک ایسی تہذیب عطا کی تھی جو مادی اعتبار سے بھی کم از کم اتنی شاندار ضرور تھی جتنی مغربی تہذیب ہے اور انتہائی بدنصیبی کی بنا پر وہ اس حقیقت کو نظرانداز کیے دے رہے ہیں کہ آج بھی صرف اسلام ہی اس کی اہلیت رکھتا ہے کہ ایک ایسی تہذیب پیدا کر کے اسے برقرار رکھ سکے جو اخلاقی اعتبار سے صحت مند معاشرتی اعتبار سے پائیدار اور معاشی اعتبار سے عادلانہ ہو۔

اس کا اصلی سبب ہماری اخلاقی اور فکری شکست خوردگی ہے جس نے ہمارے اخلاقی اور طبعی وجود میں ایک شگاف ڈال دیا ہے جو روز بروز وسیع تر ہوتا جا رہا ہے دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں جو صرف مادی ساز و سامان کی بنا پر ترقی کر سکے یا باقی بھی رہ سکے مادی وجود کی تہہ میں اخلاقی مثال پرستی اور روحانی جوش و حرارت کا ہونا ضروری ہے جو اخلاقی جرأت عطا کر سکے ان دو خصائص کے علاوہ تیسری شرط یہ کہ عمرانی وجود کے لیے باطنی اساس اور خارجی ظہور کے درمیان اتحاد کی ناگزیر احتیاج۔ جو تغیر باطن میں نمودار ہوتا ہے وہ خارجی دنیا میں ظاہر ہو کر رہتا ہے۔

عالم اسلام میں بحران کا سرچشمہ یہ ہے کہ ہم اپنے عمرانی معاشی اور سیاسی مسائل کا حل انسانی ذہن کے زائیدہ فکر اور انسانی علوم سے کرنا چاہتے ہیں اس کے برعکس یہ بحران صرف اس طرح رفع ہوسکتا ہے کہ ہم علم بالوحی اور انسانی استعداد کے زائیدہ علم کے مابین امتیازات کو ملحوظ رکھیں اور اس سوال کا حل علم بالوحی سے طلب کریں کہ اسلامی نظام معاشرت اور معاشی عدل اور "سیاسی تناقض" سے پاک ریاست کیسے وجود میں لائی جاسکتی ہے؟ ہم یہ مسائل جس وجہ سے حل نہیں کرسکے وہ اسلامی تحقیق میں اس منہاج کو اختیار کرنا ہے جس سے محسوسات کی جستجو تو ہوسکتی ہے مثالی اقدار پیدا نہیں کی جاسکتیں۔

غور وفکر کا منہاج اس لیے ضروری ہے کہ اس کے بغیر اشتراک فی العلم اور اقلیم علم میں داخل ہونا ممکن نہیں۔ ان مسائل کو حل کرنے کے لیے صحیح منہاج وہی ہوگا جس کے دو جزو ہیں؛

۱۔ بنیادی اصول یہ ہے کہ جو فضیلت حسی کے شعور میں سب سے زیادہ مکمل انداز میں ظاہر ہوتی ہے اس کے حوالے سے سمجھنا درکار ہے لہٰذا فلسفے کو کانٹ اور ہیگل کے حوالے سے سمجھنا صحیح موقف ہوگا اور مذہب کو سمجھنے کے لیے صاحبِ مذہب علی الخصوص خاتم الرسل کے حوالے سے سمجھنا سب سے زیادہ علمی موقف ہوگا کیونکہ وہی سب سے بڑھ کر تاریخی شخصیت ہیں علیہ السلام والتحیہ۔

۲۔ مسئلے کو حل کرنے کا عمل (PROCEDURE) جس کے چار مدارج ہیں؛

ا۔ تمیز (DISCREMINATION) یعنی مماثل فضائل کے درمیان امتیاز

ب۔ تعین (DETERMINATION) یعنی علم بالوحی کی ماہیت کا تعین

ج۔ تضمن (IMPLICATION) یعنی ان شرائط کا تجزیہ جن کے پورا ہوئے بغیر نصب العین کا حصول متصور نہ ہو۔

د۔ تعرف حدود صحت (LIMITATION) یعنی ان حدود کا تعین جن سے تجاوز کرکے مسئلے کا حل ناممکن ہوجائے۔

علم بالوحی اور انسانی استعداد کے زائیدہ علم کے مابین امتیازات اس وقت تک واضح

نہیں ہوسکتے جب تک "علم" اور "عمل" کے درمیان امتیازات ملحوظ نہ رکھے جائیں۔

**علم اور عمل**

علم کا موضوع حقیقت ہے اور عمل کا موضوع مقصود ہے جس کا حاصل کرنا درکار ہے۔

علم کا مسئلہ یہ ہے کہ حقیقت کیا ہے؟

اور عمل کا مسئلہ یہ ہے کہ مقصود حاصل کیسے ہوگا؟

علم کی ابتدا شک سے ہوتی ہے اور عمل کی ابتدا یقین سے ہوتی ہے۔

علم میں فکر بہت اہم ہے اور عمل میں ارادے کو اہمیت حاصل ہے۔

علم کا بنیادی تصور "جبر" ہے (علت کے حوالے سے) اور عمل کا بنیادی تصور "اختیار" ہے۔

علم کا وظیفہ توجیہہ و تعلیل ہے۔

عمل کا وظیفہ تخلیق نتائج ہے۔

علم کے تین مراحل ہیں علوم واقعہ ([illegible])

فلسفہ اور معیاری علوم ([illegible])

اور عمل کے بھی تین مراحل ہیں انفرادی، اجتماعی اور بین الاقوامی۔

علم کے مضمرات یہ ہیں کہ ایک طرف ناظر ہو جو عالم بنے گا دوسری طرف منظور ہو جو معلوم بنے گا۔ ناظر میں جاننے کی استعداد ہو اور معلوم ایسا ہو جو ناظر کی استعداد سے ادراک میں آسکے۔

بخلاف اس کے عمل کے مضمرات یہ ہیں کہ ایک طرف فعال عامل ہو دوسری طرف وہ مقصود ہو جسے حاصل کرنا درکار ہے۔

حصول مقصد کی راہ میں مزاحمت ہو اور فعال عامل کی طرف سے مزاحمت کی مزاحمت ہو تو مقصود حاصل ہوگا۔

علم کا جائزہ صحیح اور غلط کہہ کر لیا جاتا ہے اور عمل کا جائزہ حق و باطل کہہ کر۔

علم اور عمل کے درمیان ان امتیازات کے پیش نظر علم بالوحی اور انسانی علم کے درمیان امتیاز یہ ہے کہ انسانی علم واقعات و مظاہر کا علم ہے اور علم بالوحی نصب العین اور اس کے حاصل کرنے کے لائحۂ عمل کا علم ہے۔

علم اور عمل کے درمیان ان امتیازات کے پیش نظر اخلاقیات (جو انسانی استعداد کا زائیدہ علم ہے) کا مسئلہ یہ ہے کہ فضائل اخلاق کیا ہیں؟ ان کا معیار کیا ہے؟ اور ان کی مابعد الطبیعاتی اساس کیا ہے؟ بخلاف اس کے علم بالوحی کا مسئلہ یہ ہے کہ زندگی فضائل اخلاق کے نمونے پر ڈھلے کیونکر؟ یہ مسئلہ اخلاقیات سے حل نہیں ہو سکتا کیونکہ اخلاقیات اس مسئلے کے حل ہونے کے شرائط پورے نہیں کر سکتی جو یہ ہیں:

(۱) اخلاقی زندگی کا اصلاح طلب پہلو۔ (۲) اخلاقی اصلاح کی عملی اساس (۳) معیاً (۴) نمونہ کمال (۵) ایسا محرک عمل جو اخلاقی جدوجہد میں استقامت دلا دے اور انحراف سے محفوظ رکھے۔

اسی طرح معاشرے کا انسانی علم (عمرانیات) یہ مسئلہ حل کرتی ہے کہ معاشرہ کیا ہے؟ اس کے عروج و زوال کے اسباب کیا ہیں؟ بخلاف اس کے علم بالوحی جس مسئلے کو حل کرتا ہے وہ یہ ہے کہ ہر قسم کے خوف و غم سے محفوظ معاشرہ وجود میں کیسے لایا جائے؟ علم بالوحی کا وظیفہ ہی یہ ہے کہ نوعِ انسان کی وحدت کے تصور پر مبنی اخلاقی جدوجہد کرنے والے اور روحانی الذہن افراد پر مشتمل جس میں فرد اور معاشرہ ہر قسم کے خوف و غم سے محفوظ رہیں پیدا کیا جائے۔

انسانی استعداد کے زائیدہ علم (معاشیات) کا مسئلہ یہ ہے کہ تخلیق دولت کا نظام کیا ہے اس مسئلے کا حل گلہ بانی نظام، تجارتی سرمایہ داری نظام، جاگیرداری نظام، مستعمراتی نظام، صنعتی سرمایہ داری نظام اور اشتراکیت کی رو سے الگ الگ ہوگا کیونکہ ہر نظام کے معاشی تصورات مختلف ہوں گے۔ بخلاف اس کے جس مسئلے کو علم بالوحی حل کرتا ہے وہ یہ ہے کہ معاشی عدل کیسے ممکن ہے؟ اور معاشی تخلیق کی جدوجہد میں تعطل کیسے رفع ہوگا؟ معاشی تخلیق جو تعاون کا عمل ہے اس میں بطوعِ خاطر تعاون کیسے میسر آئے گا۔

انسانی استعداد کا زائیدہ علم سیاست یہ مسئلہ تو حل کر سکتا ہے کہ ریاست کیا ہے؟ اور اس کے وظیفے کو ادا کرنے کا طریق کار (آئین) کیا ہے؟ بخلاف اس کے علم بالوحی سے جس مسئلے کا حل میسر آتا ہے یہ ہے کہ ظلم و استبداد سے پاک ریاست وجود میں کیسے لائی جائے اور ریاست کی تنظیم میں سیاسی تناقض ([illegible]) کیسے

رفع ہو؟ کیونکہ اب تک انسانی ذہن نے جتنے سیاسی نظریات مدون کئے ہیں ان میں سے کوئی نظریہ تناقض کو رفع کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ کیونکہ انسانیت جمہوریت اور آمریت کے درمیان جھول رہی ہے دونوں سیاسی نظریئے حق اقتدار کے مطالبے پر مبنی ہیں۔ آمریت یا ملوکیت کی رو سے اقتدار حکمران کا حق ہے اور جمہوریت کی رو سے اقتدار عوام کا حق ہے۔

عالم اسلام جس نظریاتی بحران سے دوچار ہے وہ جس صورت سے پیدا ہوا ہے وہ یہ ہے کہ جب سے مسلمان بین الاقوامی سطح پر ایک طاقت کی حیثیت سے زوال پذیر ہوئے ہیں ان کا اعتماد وحی کی عطا کردہ ہدایت کی نتیجہ خیزی میں متزلزل ہو گیا ہے کیونکہ یقین کامیابی کی تجربی توثیق سے اور بے یقینی ناکامی کے مشاہدے سے پیدا ہوتی ہے اور تاریخی کشمکش میں ان کی ناکامیوں نے انہیں اعتماد اور یقین سے محروم کر دیا ہے کیونکہ ناکامی اور شکست خوردگی مایوسی اور اعتماد سے محرومی میں مبتلا کرتی ہے۔

بہرحال وحی کی عطا کردہ ہدایت کی نتیجہ خیزی میں ایمان اور خوداعتمادی کو بحال کرنے کے لیے ہمیں اس حقیقت کو سمجھنا ہی ہو گا کہ تاریخی انقلابات کے تحت مؤثرات زندگی کے بدل جانے سے قانون سازی بے اثر ہو گئی ہے اور ہم ابھی تک قانون سازی کے ذریعہ اپنی ملی تجدید کی آرزو سے اس لیے دست بردار نہیں ہوتے کیونکہ ماضی میں قانون سازی مؤثر رہ چکی ہے لیکن ہم یہ سمجھنے میں ناکام رہے ہیں کہ قانون کا وظیفہ اقدار حیات کی حفاظت کرنا ہے بشرطیکہ وہ موجود ہوں اور قانون کو قوت نافذہ میسر ہو اگر وہ مٹ گئی ہوں تو قانون انہیں پیدا نہیں کر سکتا ہمارے ترقی کرنے کا صرف یہی امکان ہے کہ ہم قرآن سے قانون حیات کی جستجو کرنے سے پہلے فقہی قانون سازی کے ذریعہ اقدار حیات پیدا کر سکیں گے۔

**تعیّن:** قرآنی وحی کے عطا کردہ علم کی ماہیت کو متعین کرنے پر مشتمل ہے کہ وحی قرآنی کا کام اس نصب العین اور اسے حاصل کرنے کے ناقابل تغیر اور ناقابل شکست لائحہ عمل کو پیش کرنا ہے۔

زندگی مجموعہ اضداد ہے۔

انفرادی سطح پر جس نصب العین کے حوالے سے اصلاح ہوگی وہ رضائے الٰہی کا حصول یعنی انسان مرتضیٰ بننا ہے۔

اجتماعی سطح پر زندگی اطاعت و انحراف کے تضاد پر مشتمل ہے جس نصب العین کے حوالے سے اصلاح پذیر ہوگی وہ ایک مثالی معاشرے کا قیام ہے جو ہر قسم کے خوف و غم سے محفوظ ہو معاشرتی پہلو میں تفاخر اور تحقیر سے پاک ہو۔ معاشی پہلو میں عدل کا ضامن ہو اور معاشی تخلیق میں تعطل کو رفع کرنے کا ذمہ دار ہو اور سیاسی پہلو میں سیاسی تناقض Political antimony سے پاک ہو۔

- ــــ بین الاقوامی سطح پر زندگی عداوت و عناد اور اس کے جوابی عمل یعنی جنگ در جنگ کا مظہر ہے اس کی اصلاح وحی قرآنی کے عطا کردہ نظام کے غلبے پر منحصر ہے۔
- ــــ وحی کے عطا کردہ علم سے ایک ایسا تصور کائنات بھی میسر آتا ہے جو حصول نصب العین کی جدوجہد میں انسان کی کامیابی سے بتمام و کمال ہم آہنگ ہو۔
- ــــ ایک ایسا مؤقف یا زاویہ نگاہ بھی فراہم کرتا ہے جو افراد کو ایک امت کی شکل میں متحد کر دے، یہ "رحمت" کا زاویہ نگاہ ہے۔

یہ ایک ایسا معیار بھی پیش کرتا ہے جس کے حوالے سے اعمال کے پسندیدہ اور ناپسندیدہ ہونے کو پرکھا جاسکے۔

وہ معیار یہ ہے:

فلا وربک لا یومنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما۔

(پس نہیں! آپ کے رب کی قسم وہ اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے جب تک اپنے درمیان اختلاف میں آپ کو اپنا حکم نہ بنائیں اور پھر جو فیصلہ آپ فرمادیں اس پر دلتنگی محسوس نہ کریں اور اسے پوری طرح دل سے تسلیم کریں۔

ــــ یہ وہ لائحہ عمل بھی فراہم کرتا ہے جو انفرادی اجتماعی اور بین الاقوامی سطح کے نصب العین

تک پہنچا کر رہے۔

- یہ ایک دعوت بھی پیش کرتا ہے جس پر حیات اسلامی کا دوام و استمرار منحصر ہے جو نصب العین، تصور کائنات، زاویہ نگاہ، معیار اور لائحہ عمل پر مشتمل ہے۔ جب یہ ایمان بالغیب (یعنی اس کامیابی پر ایمان جو ابھی غیب میں ہے) کی اساس بھی مہیا کرتا ہے جو جدوجہد سے پہلے ضروری ہے۔
- یہ ایسے کائناتی قوانین بھی متعین کرتا ہے جن پر انسان کی مثالی جدوجہد میں کامیابی منحصر ہے۔
- یہ حق و باطل کے امتیازات بھی واضح کرتا ہے۔
- یہ مفاد پرستوں سے صلح اور جنگ کے قواعد بھی مقرر کرتا ہے۔
- یہ مفاد پرستوں سے تصادم کے لمحات بھی متعین کرتا ہے۔
- یہ نفع بخشی اور مفاد پرستی کے ملے جلے رجحانات کی اصلاح کے طریقے بھی واضح کرتا ہے۔
- یہ سیرت و کردار کی تشکیل کے قاعدے بھی سکھاتا ہے۔
- یہ عمرانی روابط کو خوشگوار بنانے کے طریقے بھی تلقین کرتا ہے۔
- ایسے کائناتی قوانین کی ترجمانی بھی کرتا ہے جن کے بغیر ترقی متصور نہیں ہو سکتی۔
- یہ سعادت و شقاوت کے ایسے قوانین کی تشکیل بھی کرتا ہے جسے کوئی مفاد پرست جماعت اور کوئی شیطانی طاقت شکست نہیں دے سکتی۔

**تضمن**: تضمن ان مضمرات (ضروری شرائط) کے تجزیے پر مشتمل ہے جن پر یقیناً کامیابی منحصر ہے۔

مثلاً غایت تخلیق بعثت اور غایت نزول وحی کا ایک ہی غایت ہونا ۔ اور ان ناقابل تغیر اور ناقابل شکست قوانین کی تشکیل جو نظامِ تکوینی میں مضمر ہیں۔

**حدود و صحت کا تعارف**: اس میں مضمر ہے کہ علم بالوحی کی صحت اور نتیجہ خیزی کے حدود کو واضح کیا جائے وہ حدود یہ ہیں کہ اگر علم بالوحی کو انسانی استعداد کے زائیدہ علم کے نمونے پر ڈھال دیا جائے تو اس سے عملی زندگی میں

نتائج پیدا ہونے بند ہو جائیں گے۔ مثلاً جب علم بالوحی سے یہ مسئلہ حل کیا جانے لگے کہ فضائل اخلاق کیا ہیں ان کا معیار کیا ہے؟ اور ان کی مابعد الطبیعاتی اساس کیا ہے؟ تو زندگی کا فضائل اخلاق کے نمونے پر ڈھلنے کے لیے قرآن سے رہنمائی طلب کرنے کے بجائے اپنے اقدام پر انحصار کرنا پڑے گا اور ہماری جد و جہد سے وہ شرائط پورے نہیں ہو سکے ہیں نہ ہو سکتے ہیں۔

جب علم بالوحی سے عمرانیات کا مسئلہ حل کیا جانے لگے کہ مثالی معاشرہ کیا ہے؟ اس کے عروج و زوال کے اسباب کیا ہیں تو پھر اس علم سے مثالی معاشرہ کی تخلیق ناممکن ہو جائیگی۔

جب علم بالوحی سے معاشیات کا یہ مسئلہ حل کیا جانے لگے کہ تخلیق دولت کا نظام کیا ہے یا عادلانہ معیشت کیا ہے تو یہ مسئلہ حل کرنا ممکن نہ رہے گا کہ معاشی عدل پیدا کیسے ہوگا؟ اور جب علم بالوحی سے یہ مسئلہ حل نہ ہو سکے گا کہ اسلام کا نظام سیاست وجود میں کیسے لایا جائے۔

کیونکہ جن شرائط کے پورا ہونے پر علم بالوحی کی نتیجہ خیزی منحصر ہے انسانی استعداد کے زائیدہ علم کے نمونے پر ڈھل جانے کے بعد انکی جستجو باقی نہیں رہتی کیونکہ انسانی استعداد کے زائیدہ علم کی نشوونما کی تکمیل کا رخ بھی ابھی تک عقلیت یا حسیت کے منہاج کے تابع رہ جانے کی بنا پر متعین نہیں ہو سکا۔

دور حاضر میں عالم اسلام جس بحران سے دوچار ہے اس پر غالب آنے کے لیے پیغمبرانہ بعثت کے مقاصد کے لیے انقلاب لانا ضروری اور اس مقصد کی خاطر قرآن سے یہ جستجو کرکے کہ اس کے نازل ہونے کا مقصد اسلامی انقلاب برپا کرنا ہے یہ ضروری ہوگا کہ ہم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیغمبر انقلاب اور قرآن مجید کو صحیفۂ انقلاب کی حیثیت سے پیش کریں یہ اسلامی تحقیق سے ممکن ہوگا۔ لیکن اپنے دشمنوں کے نقطہ نظر کو بالکل اندھوں کی طرح اپنا کر ہم نے "گورکنی" اور" استخوان فروشی" کو اسلامک ریسرچ سمجھا ہے ورنہ ہم اس بحران پر غالب آ سکتے تھے۔

ہماری مشکلات کا اصلی سرچشمہ یہ ہے کہ ہم نے مقاصد کے لیے اپنی اصطلاحوں میں اپنے منہاج کے مطابق غور و فکر کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی ورنہ اسلامی تحقیق سے اس بحران کا علاج ہو سکتا تھا۔

ہم نے قرآن سے منہاج کی تمنا قرآن کی اس آیت کے باوجود نہیں کی کہ اللہ پاک فرماتا ہے " لکل جعلنا منکم شرعة ومنھاجا "ہم نے سب کے لیے " شرع "اور منہاج بنایاہے ہم نے قرآنی منہاج (جس کی جستجو قرآن کو فرقان مان کر کی جا سکتی ہے) کو چھوڑ کر دوسری چیزوں پر اپنی توجہ مرکوز کردی اور صحیح خطوط پر اور صحیح منہاج کے مطابق اسلامک ریسرچ کو نظر انداز کردیا اگر قرآنی ہدایت کی رہنمائی میں ہمارا یقین متزلزل نہ ہوگیا ہوتا تو ہم اس نظریاتی بحران کا علاج قرآن سے اسلامی تحقیق کے مسئلے کو حل کرکے تلاش کر سکتے تھے۔

قرآنی ہدایت کی رو سے اسلامی نظام افکار کے نمایاں پہلو یہ ہیں:

(۱) غایت یا نصب العین (۲) تصور کائنات (۳) زاویہ نگاہ (۴) معیار (۵) دعوت (۶) لائحۂ عمل۔

## نصب العین

قرآن مجید کا نصب العین یہ ہے کہ ایک معاشرہ نوع انسانی کی وحدت کے تصور پر مبنی اخلاقی جدوجہد کرنے والے اور روحانی الذہن افراد پر مشتمل قائم کیا جائے جن کی جدوجہد کا رخ یہ ہو کہ فرد اور معاشرہ ہر قسم کے خوف وغم سے محفوظ رہیں جس کے استحکام کی بنیاد محمد رسول اللہ صلعم سے خالص وفاداری ہو جسے انجام کار غلبہ حاصل ہو۔ اور اس نصب العین کے کما حقہٗ حصول کے لیے ضروری ہے کہ نظام کائنات اپنی ساخت میں اس نصب العین کے حصول کی جدوجہد سے سازگار ہو چنانچہ دیکھنا یہ ہوگا کہ قرآن کا تصور کائنات کیا ہے؟

## تصور کائنات

کائنات اللہ تعالیٰ نے ایک مقصد کے پیش نظر تخلیق فرمائی ہے اسی مقصد کو حاصل کرنے کی جدوجہد میں ہدایت دینے کے لیے قرآن مجید نازل ہوا۔ اور یہ کائنات اس مقصد کے حاصل کرنے میں اس جدوجہد کی کامیابی کے لیے کامل سازگاری رکھتی ہے۔ تصور کائنات وحی سے حاصل ہوتا ہے جو

نصب العین کے حصول کی شرط ہے اور اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ موجودہ حالات و واقعات اور مستقبل کے امکانات کا جائزہ ہے اور صرف اسی کی بنیاد پر نصب العین متصور ہو سکتا ہے۔ دراصل جو کونیاتی قانون کو نیاتی عمل کو متعین کرتا ہے۔ جسے اسطرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ دو گروہ ہوں جن کے الگ الگ مقصد ہوں ان مقاصد کے پیچھے وفاداریاں بھی دو ہوں جنہیں روبہ عمل لانے کے لیے دو منظم ارادے بھی موجود ہوں انہی ارادوں کے درمیان تصادم عمل میں آئے اس تصادم کو کامیاب بنانے کے لیے ہر دو کے اپنے اپنے پروگرام ہوں ایک کا مزعومہ مفاد کی حفاظت کا اپنا لائحہ عمل اور دوسرے کا عام نفع بخشی اور مفاد عام کی تکمیل کا اپنا منفرد پروگرام مزعومہ مفاد باطل ہے اور مفاد عام کی تکمیل حق ہے' اللہ تعالیٰ حق کو باطل سے ٹکراتا ہے اور انجام کار حق باطل پر غالب ہو کر رہتا ہے۔ تاریخی قانون اور اخلاقی قانون میں ایک ربط سے تضاد کی صورت دراصل حق کے باطل پر غالب کی ایک سازگار شرط ہے جب تاریخی تضاد مضمحل ہو جاتا ہے تو اخلاقی اصول پیدا ہوتا ہے تضاد سے جدوجہد میں استقامت کے لیے ایک نفسیاتی محرک میسر آتا ہے جتنا تضاد شدید ہو گا اتنا ہی اخلاقی استحکام پیدا ہو گا۔

**زاویہ نگاہ** زاویہ نگاہ قرآن کی رو سے وہ موقف ہے جس کے حوالے سے چیزوں اور اعمال پر نظر کی جاتی ہے اس کے تعلق میں ان کا موازنہ کیا جاتا ہے اور تخمینہ لگایا جاتا ہے۔ رحمت کا نقطۂ نظر ہی دراصل وہ اجتماعی ذہن مہیا کرتا ہے جس کا ہر متنفس آرزومند ہے۔ اس کے بغیر نہ تو فرد انفرادیت سے نکل کر معاشرے کا رکن بن سکتا ہے اور نہ خود غرضی کے چنگل سے آزاد ہو سکتا ہے۔

**معیار** وحی سے حاصل ہونے والا حکم معیار ہے جو اعمال حکم کی تعمیل میں صادر ہوں خیر اور جو اس کی خلاف ورزی میں سرزد ہوں وہ شر ہیں۔ اس ضمن میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی نمونۂ کمال کی حیثیت رکھتی ہے جن کے حوالے کے بغیر نہ تو کسی خیر و کمال کا خیر و کمال ہونا باور ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس کا قابل حصول ہونا۔

**دعوت** جہاں تک دعوت کا تعلق ہے تو کسی ہدایت کی قبولیت کی ایک اساس یہ بھی ہے کیونکہ اسی سے جماعت کی بقا اور اس کا دوام و استمرار وابستہ ہے لہٰذا جماعت ہی دعوت پہ مامور رہے دعوت و تبلیغ کی بدولت عالمگیر وفاداری پر منظم دوسرے تازہ دم گروہوں کو اپنے اندر شامل کر کے اختلال سے محفوظ ہو جا سکتا ہے بخلاف اس کے محدود وفاداریوں پر منظم گروہوں کی معذوری یہ ہے کہ جب تاریخی جدوجہد میں اُن کے اعصاب تھک جاتے ہیں تو وہ زوال کے بعد دوبارہ ابھرنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتے ہیں۔

**لائحہ عمل** آخر میں ہم قرآن کے مقصود عمل کو پانے کے لائحہ عمل کے بیان کے بعد اپنی گفتگو کو ختم کر دیں گے کیونکہ قرآن کے مطابق لائحہ عمل کی حیثیت یہ ہے کہ یہ پہلے سے متعین کردہ فرائض و اعمال کا وہ گوشوارہ ہے جس سے مطلوبہ نتائج پیدا ہو کر رہیں گے اس پروگرام کے کل تین مدارج ہیں۔انفرادی، اجتماعی اور بین الاقوامی۔

پہلے مرحلے میں تلاوت آیات، تزکیہ نفوس اور تعلیم کتاب و حکمت پر اصرار ہے۔ دوسرے مرحلے میں پہلے مرحلے کے نتیجے کے طور پر ادارت وجود میں آتے ہیں اور افراد و ادارت کے عمل کو منظم کرنے کیلئے ایسے اوامر و نواہی پر مشتمل ضابطہ مہیا کیا جاتا ہے تاکہ اسکے ذریعے اسلامی فضائل کو محفوظ اور ان کے خلاف ارتکاب جرائم کو مسدود کیا جا سکے۔

تیسرے مرحلے میں ان اداروں کو چند ناگزیر سوالات سے سابقہ پڑتا ہے۔ قرآن کا پیش کردہ لائحہ عمل ان کے شافی جوابات مہیا کرتا ہے۔

سوالات یہ ہیں؛

۱۔ کونسا مخصوص تضاد اپنے اندر یہ ضمانت رکھتا ہے کہ اسے ابھارا جائے تو وفاداری متعین ہو سکے۔ جماعت منضبط رہے اور تصادم فیصلہ کن نتائج پیدا کر سکے۔

۲۔ جب تک تصادم کو دعوت دینے کی طاقت نہ ہو، پروگرام کی شکل کیا ہو کہ ولولہ سرد نہ ہو تاکہ قبل از وقت تصادم کو التوا میں رکھنے پہ قدرت حاصل رہے۔

۳۔ اس لائحہ عمل کے کتنی اقسام کے ردعمل پیدا ہوں گے اور ان کی بے خطا پیش بینی کیسے ممکن ہو گی۔

جوابات یہ ہیں۔

۱۔ پہلے سوال کے جواب کے لیے یہ دیکھنا ہوگا کہ قرآن کے خود اپنی نسبت اس دعوے کہ وہ الفرقان بھی ہے کے کیا بدیہی نتائج ہیں یعنی قرآن کن امتیازات اور اختلافات کو واضح کر کے اپنے آپ کو الفرقان ثابت کرتا ہے تو سب سے اولین اور اہم اصول یہ متحقق ہوگا کہ یہ تضاد محمد رسول اللہ صلعم کی تصدیق و تکذیب کا تضاد ہے اسی سے حزب اللہ اور حزب الشیطان کا تعین ہوگا۔ جو لائحہ عمل پر عمل درآمد کے دوران ہمیں دوسرے سوال سے دوچار کر دے گا۔

۲۔ جب یہ تضاد اُبھر کر سامنے آجائے گا لیکن مزاحمت ابھی اُس نکتے تک نہ پہنچی ہو جہاں تصادم کو دعوت دی جاسکے تو لائحہ عمل کے خطوط اس متوقع تصادم کے لیے ممکنہ تیاری پر مشتمل ہوں گے یہ پروگرام دشمنی کے کسی ضابطے کی رُو سے قابلِ اعتراض نہیں ہو سکتا جب ارکان اتنے قوی ہو جائیں کہ جان کی بازی لگانے کی پوزیشن میں آجائیں اور جارحانہ اقدام کا جواب دے سکیں تو تصادم قبل از وقت نہ ہوگا۔ لیکن تصادم کی صورت کے بالکل سامنے آموجود ہونے سے پہلے ہمیں تیسرے سوال کے جواب کے لیے پوری طرح تیار ہونا ہوگا۔ یعنی۔

۳۔ اس لائحہ عمل کے ردِّ عملوں کی اقسام کا تعین اور ان کی بے خطا پیش بینی تو قرآن کے جواب کے مطابق یہ ردِ عمل تین طرز پر متشکل ہوگا۔ ایمان، کفر اور منافقت اور اس سے تین گروہ وجود میں آئیں گے مومن کافر اور منافق۔ قرآن ان کی سیرت اور نفسیات جزئیات کی حد تک کھول کھول کر بیان کرتا ہے بلکہ ان کی طرف سے تصادم کی صورتوں پر بھی خوب روشنی ڈالتا ہے تاکہ حزب اللہ کو اُن کی مزاحمت اور اُن سے تصادم کے عمل میں کوئی ابہام نہ رہے۔ تاکہ اس پروگرام پر عمل پیرا ہونے والی جماعت اس احساس سے سرشار ہو کر یہ پروگرام یقیناً قطعاً اور حتماً نتیجہ خیز ہوگا اور جس کی کامیابی منطقی استدلال کی احتیاج سے بے نیاز ہوگی۔